معیارِ نقد اور نقد النقد کی روایت

(''تنقیدی وتجزیاتی زاویے'' کے تناظر میں)

محمد علی چراغ ☆

ABSTRACT

In order to sublimate research, a trend of research on research is flourishing now-a-days. Similarly, there is also a need of criticism on criticism to elevate the standard of criticism. But, unfortunately, lack of tolerance, partiality and prejudice have polluted the spirit of criticism. Some critics opine that to give a verdict of atheism against somebody or to labelize him can only be a reasonable and satisfactory answer.

Professor Ghazi Ilm-ud-Din has strongly condemned such negative attitudes in criticism, in his book *"Tanqeedi wa Tajziyati Zawyey"*. He wants to see research and criticism at their heights. His book that consists of 22 critical essays is a specimen in this regard. The following essay shows his critical insight.

☆ ریسرچ آفیسر، مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ، لاہور

یہ ایک مسلمہ علمی حقیقت ہے کہ 'تنقید' کسی بھی تخلیق یا فن پارے کو خوش اطواری اور لطافتِ طبع کے ساتھ صیقل کرنے کا فریضہ ادا کرتی ہے۔ ہمیں جو تنقیدی رویے میسر آئے ہیں، وہ اگر چہ ایک حد تک مطالعۂ ادب کو گوناں گوں جہات سے متصف کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود دیکھا یہ گیا ہے کہ کئی تخلیقی شاہ کار (بعض اوقات برسوں تک اور کئی بار مستقلاً) تشنۂ تحسین رہ جاتے ہیں۔ پھر کئی کتابیں اور تحریریں جو اپنے ابدی معیار و مرتبہ سے ادنیٰ ہوتی ہیں، لسان و ادب میں ان کا مقام اور حصہ بالکل نہیں ہوتا، اس کے باوجود صرف ''بیسٹ سیلر'' یا مقبول عام ہونے کی وجہ سے تنقید نگاروں کو متاثر کر جاتی ہیں۔ وہ تخلیقات جو فی الواقع ایسی بلند پایہ ہوتی ہیں کہ ان کی ادبی حیثیت، باطنی اوصاف اور مقصدیت بدوش حقائق سے مرصع ہونے کے باوجود تنقید کی صیقل نگاری سے محروم رہ جاتی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ کئی بار تخلیق اور فن پارہ کے متعدد مثبت کمال، خوبیاں، عمدگیاں، توانائی، خیر اور حُسن کی پاکیزگی، شائستگی اور ترغیب و تحریص بلند اخلاقی سب نقد و نظر کے مستعار پیمانوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔

کسی کتاب، فن پارے یا تخلیق کی مقبولیت اور عوامی پسندیدگی تو معیارِ ادب اور سرمایۂ نقد نہیں ہوتا۔ بلا شبہ تصنیف و تالیف ایک واجب الاحترام اور ضروری کام ہے، لیکن اس میں ادبیت اور اعلیٰ درجے کا ادبِ عالیہ بننے کی خوبی تو متعدد امور و عوامل کی موجودگی سے پیدا ہوتی ہے۔ کیا امریکیوں کی سب سے پسندیدہ کتاب ''دی روٹس'' اور پھر ایک فکری انقلاب آفرین کتاب ''دی بلیک سی گل'' کروڑوں کی تعداد میں فروخت ہونے کے باوجود ادبِ عالیہ کا حصہ بن سکیں؟ اسی طرح آج کے برازیلی مصنف پاؤلو کوئیلو کا ناول ''دی الکیمسٹ'' دنیا کی سو سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہو کر کروڑوں کی تعداد میں فروخت ہو چکا ہے، کیا وہ ادبِ عالیہ کا حصہ بھی ہے؟ محض ایک مقبولِ عام کتاب صرف اپنی دانشِ مشرق کی بازگشت کے زور پر پسندیدہ 'بیسٹ سیلر' بن چکی ہے۔

ادبِ عالیہ اور شاہکار تخلیق کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس ادب پارہ میں قواعدِ ادب اور ضوابطِ لسانی کے ساتھ ساتھ داخلی و خارجی فکری و فنی اوصاف اور تخلیق کار کی طرف سے تحلیلِ نفسی کی راہیں بھی سجھائی دیں تا کہ ابلاغ اور تفہیم ممکن ہو سکے۔ جو بھی تخلیق جس بھی ہیئت اور صنف میں ہو، اس کے ادبی اور فنی لوازم پر بھی پوری اترتی ہو، اور اس میں تنقید نگار کے لئے بھی بحوالہ نقد و نظر برائے شراکت کوئی جان اور جاذبیت موجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج بقول پروفیسر غازی علم الدین ہر تحقیق بھی 'تحقیق التحقیق' کی متقاضی ہوتی ہے، اور ہر تحقیق پر مزید تحقیق یا 'تحقیق بر تحقیق' ہونی بھی چاہیے۔ اس کے بعد ''نقد النقد'' پیدا ہوتی ہے۔ نقد النقد کیا ہے، اس میں کسی تخلیق یا فن پارے کو نقدِ ثانی نہیں بلکہ 'نقدِ مکرر از دیگراں' کے مرحلے میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس عمل میں وہ خاص تخلیق ادبی طور پر تائید و توثیق کی دولت سے فیض یاب ہوتی ہے یا پھر تنسیخ و تردید کی زد میں آ کر تخلیق کار کے لئے غور و خوض کی نئی وادیوں کی تلاش کا موجب بن جاتی ہے۔ صاحبِ نقد و نظر اور تخلیقِ کار اصل میں دونوں ایک ہی اکائی کی دو انتہائیں ہیں جو بہر صورت ایک دوسرے کے لئے ضروری اور لازمی ہیں۔ نقد النقد میں تنقید نگار اوصافِ درونِ تخلیقِ کار پر بھی بحوالہ تخلیق بات کرتا ہے اور ان حقائق کے قارئین پر اثرات کے ضمن میں بھی ذمہ داری کے ساتھ عہدہ برآ ہوتا ہے۔

تخلیق کار اور تنقید نگار اپنے ادبی تخلیقی منصب کے اعتبار سے ہم نوا، ہم خیال، ہم احساس، ہم رخ اور ہمہ اوصاف دو اہم اور باہم مربوط اکائیاں ہیں۔ تخلیق اور تنقید دونوں فکر و فن کو نئے تجربات اور نقد و نظر کے نو بہ نو زاویوں کو متعارف کراتے ہیں۔ اس

طرح تخلیق کار، تخلیق اور تنقید نگار تینوں ایک معنوی مثلث بناتے ہیں۔ اس اصلی مثلث کا ہر رکن قارئین کو راحت و مسرت اور نشاط و انبساط کے ساتھ فروغِ امن وسکون، ترویج خیر وحُسن اور ترغیب صداقت وحقیقت کا علم بردار ہونا چاہیے۔ صاحبِ نقد ونظر، وسعتِ نظری، رفعتِ افکار اور تہذیبی وثقافتی اقدار کی نمو کے لئے اپنے ہر طرح کے ادبی تنقیدی لوازمات کو بروئے کار لاتا ہے۔ جس طرح کوئی تخلیق کار اپنی تخلیق کو سنوارنے اور سدھارنے کی خاطر اور اپنی تخلیق کو بہتر سے بہتر بنانے کے تخلیقی عمل سے گزرتا ہے، اسی طرح نقاد بھی اپنے رویوں، دستورِ انتقاد اور روشِ تعینِ قدر و قیمت کے محتاط مراحل سے گزرتا ہے۔ اسی لئے تو بہتر اور معیاری تنقید بھی بذاتہٖ ایک طرح کی تخلیق بھی بن جاتی ہے۔ اس تناظر میں پروفیسر غازی علم الدین کے تنقیدی وتجزیاتی زاویے، ایک ایسی کوشش ہے جو نئے تنقیدی رویوں کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیتی ہے۔

پروفیسر غازی علم الدین کی تازہ کتاب ''تنقیدی وتجزیاتی زاویے'' بائیس مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ تنقیدی مضامین ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۴ء تک پاکستان، بھارت اور یو کے کے بعض علمی ادبی پرچوں کی زینت بن چکے ہیں۔ مرتب نے یہ تنقیدی، تجزیاتی تحریریں پوری دیانت داری کے ساتھ ناقدانہ انداز واسلوب میں پیش کی ہیں۔ ہر زیرِ تنقید کتاب یا تحقیق کو پورے محاکمانہ ضوابط کے تحت جانچنے اور آنکنے کی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔ تنقیدی زاویوں کے لئے تخلیقات کے انتخاب میں علم وادب کے جاری دھارے ہی سے چند اہم موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ مصنف کی تنقید کا ممتاز وصف یہ ہے کہ اس سے مجموعی تنقیدی شعور اور تجزیاتی قرینوں کو تقویت ملتی ہے۔ علمی، ادبی، تحقیقی، تاریخی، سیاسی اور بالخصوص دینی تسامحات اور ابتذالی طرزِ تحریر پر بھی بے ریا رائے زنی کی گئی ہے۔ اس حوالے سے غازی صاحب کے یہ مضامین بے جا مدح سرائی سے مبرا ہوتے ہوئے نقد ونظر کے عمدہ معیاروں سے ہر تخلیقی نگارش کی قدر و قیمت کا تعین بھی کرتے ہیں۔

کتاب میں موجود دو مضامین بتخصیص قرآنی حوالے کے ہیں، یعنی ''تفسیر مطالب الفرقان کا علمی وتحقیقی جائزہ'' اور ''حضرت یونسؑ اور قومِ یونسؑ کا تاریخی اعزاز''۔ اس وقت دنیا جس فکری اور نظری انتشار سے گزر رہی ہے اس کے نتیجے میں جو نیا ''پیراڈائم'' (تناظر) تشکیل پا رہا ہے، اس میں دین (اور مذاہب) کا کردار وعمل بھی اہم ہوگا۔ ایسی صورت میں مسلمان کہ جو دینِ حق کے وارث ہیں ان کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ برائے غور فکر میں معروض ہوں کہ عربی زبان زمانہ نزولِ قرآن سے پہلے ہی بہت منجھ چکی تھی۔ لہٰذا خالق قرآن نے مناسب سمجھا کہ عربی کی وسعت وجامعیت کی حامل عربی جاننے والی قوم کو قرآن مجید کے لسانی اعجاز سے بھی عاجز کیا جائے۔ اس دور میں عجمی قوموں کی سیاسی ثقافتی اور مذہبی ولسانی ترجیحات اور ہی طرح کی تھیں۔

عربوں کے ہاں شعر وشاعری کا زیادہ رواج تھا اور سب کچھ زبانی ہی آگے منتقل ہوتا تھا۔ لیکن آج کا عربی لٹریچر جو ہم تک پہنچا ہے اس کا بیش تر حصہ عہدِ عباسی (۷۵۰ء-۱۲۵۸ء) کہ جس کا مرکز بغداد تھا، کا ہے۔ لہٰذا سارا عربی ادب عراق ہی کی سرزمین سے نشوونما پا کر نکلا۔ اسی دور میں کتب احادیث وسیر اور تاریخ وآثار مرتب ہوئیں۔ عربی کی صرف ونحو کے قواعد بھی مرتب ہوئے۔ لغت کی کتابیں بھی ترتیب وتالیف کے زیور سے آراستہ ہوئیں۔ عجب ماجرا یہ ہوا کہ جن حضرات نے یہ کتابیں مرتب کیں (باستثنائے معدودے چند) سب غیر عرب، یعنی عجمی تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عباسیوں ہی کے عہد میں عجمی تصورات

وخیالات ساری علمی ادبی اور سیاسی فضا میں بھی پھیل چکے تھے۔ اسی دور میں ایرانی مسلمانوں نے بھی تجمع وترتیب احادیث اور قرآنی تفاسیر پر بھی بے پناہ کام کیا۔ فارسی میں توس، بیس جلدوں سے لے کر پانچ سو جلدوں پر مشتمل بھی تفاسیر قرآن ترتیب دی گئیں۔ یوں عربی زبان اور تصنیف وتالیف دور اول ہی سے غیر عربی تصورات کی حامل بن گئی تھیں۔ بقول علامہ احمد امین مصری مرحوم ''ایرانی علم وادب نے عربی علم وادب کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا تھا''۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا یوں کہ پورا اسلامی ادب اور دینی تعلیمات بھی عربوں (کہ جو صحیح معنوں میں زبان عربی پر عبور رکھتے تھے اور اپنی فصاحت اور خوش بیانی کے باوصف اپنے سوا دوسروں کو ''عجمی'' قرار دیتے تھے) کی دسترس سے نکل کر عجمیوں کے حصے میں آ گئی تھیں۔

پھر عجمی دنیا میں تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں قرآن مجید کی اہم آیات کی ''شان نزول'' کی مداخلت کر کے قرآن مجید کی آیات کا مفہوم آیات کے الفاظ اور اصطلاحات کی رو سے نہیں بلکہ واقعات اور سوختنی تاریخ کی رو سے متعین کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور کمال یہ ہے کہ خلوص کے ساتھ سمجھ یہ لیا گیا تھا کہ وہ واقعات ہی دراصل ان آیات کے نزول کا سبب تھے۔ اس روشِ تفکر کا ایک منفی تاثر یہ ملنے لگا کہ نزولِ قرآن ہنگامی واقعات پر مبنی ہے۔ یوں قرآن مجید کی ابدیت بھی مجروح ہوتی گئی۔

اس ساری صورتِ حال کے باوجود بالخصوص قرآنی عربی کی ایک داخلی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ خارجی اسباب وامور سے اثر پذیر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس پر صحیح غور وفکر سے الفاظ کے اساسی معنوں کی بدولت صحیح مفہوم تک پہنچنا مشکل نہیں رہتا اور یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے دنیا بھر کے تمام صحائف ماسوائے قرآن مجید، اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں ہیں، اکثر صحائف تحریف زدہ ہیں۔ قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ یہ واحد صحیفہ غیر محرف ہے اور قیامت تک اس میں تحریف نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ایک بلند درجہ طبقۂ علماء قرآنی الفاظ واصطلاحات کے تعین میں اور ان کے معانی کے لئے قرآن مجید ہی سے مدد لیتا رہا ہے۔ وہ طبقہ بذریعہ تصریفِ آیات ہر امر کو بحوالہ قرآن مجید ہی سمجھنے پر زور دیتا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غلام احمد پرویز کی ''تفسیر مطالب الفرقان'' اسی نہج کی ایک جدید کوشش ہے۔ اکثر قرآن شناس بزرگوں کا یہ ایمان ہے کہ قرآن مجید واحد ایک ایسی کتاب ہے جو اپنی وضاحت خود ہی کرتی ہے یعنی یہ ایک خود وضاحتی (*Self Explanator*) کتاب ہے۔

''تفسیر مطالب الفرقان'' کا تنقیدی جائزہ لے کر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والے مقالہ نگار جناب حافظ محمد دین قاسمی صاحب بخوبی جانتے ہوں گے کہ غلام احمد پرویز خود علامہ اقبال کے بہت بڑے شارح تھے۔ انھوں نے 'قرآن اور اقبال' پر بھی کتب لکھی ہیں۔ جناب مقالہ نگار (محمد دین قاسمی) کے دو جلدوں پر ۱۳۷۲ صفحات پر مشتمل پی ایچ ڈی کے تھیسز (بعنوان ''تفسیر مطالب الفرقان کا علمی وتحقیقی مطالعہ'' مطبوعہ ادارہ معارفِ اسلامیہ منصورہ، لاہور) کے بارے میں پروفیسر غازی علم الدین کا تنقیدی تجزیہ پڑھ کر عیاں ہوتا ہے کہ مقالہ نگار محمد دین قاسمی نے اس قدر مبسوط مقالے میں سنجیدہ علمی، تحقیقی اور مطالعاتی امور پر چنداں توجہ نہیں فرمائی بلکہ یہ مقالہ جس معیارِ متانت اور بحوالہ موضوع جس بالغ نظری اور جس حسنِ حزم واحتیاط کا متقاضی تھا، اس کے بجائے یہ ''روقادیانیت'' یا ''روِ وہابیت'' کے زمرے کی شے بن گیا ہے۔ سرسید احمد خان علامہ محمد اسلم جیراجپوری اور علامہ اقبال کی فکر کے پروردہ فرد پر صرف لیبل لگا کر قرآنی بصیرت اور اشتقاقی نتائج کو صرف ذاتی اور غیر ادبی فروعی تعصب کی نذر کر دینا اقلیمِ علم

وادب میں ایک غیر ذمہ دارانہ اور محض ایک منفی رویہ ہے۔ ناقد (محمد دین قاسمی) نے علمی اصول وضوابط کی بھی پروا نہیں کی۔ یہی نہیں بلکہ اس قدر سنجیدہ، اہم اور متعین موضوع پر ڈاکٹریٹ کے مقالے میں تحقیقی تقاضوں اور تجزیاتی جائزوں کو بھی مخصوص معیاری اوصاف کے بجائے کمیتی اور مقداری طور پر پیش کر کے رکھ دیا ہے۔ مطالعاتی سنجیدگی اور علمی شرافت وشوکت حافظ محمد دین قاسمی کے روّیے سے حسنِ علم وادب سے بہت حد تک بعید ہوگئی ہے۔

غازی علم الدین کے مختصر سے تنقیدی وتجزیاتی مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاصر مقالہ نگار (حافظ محمد دین قاسمی) نے قرآن فہمی کے ایک سب سے بڑے موضوع کو وسعت وطوالت تو خوب بخشی ہے لیکن ایک مفکر قرآن کے خیالات کو ''لکم دینکم ولی دین'' کے مصداق بھی نہیں بخشا۔ علم وادب اور نقد ونظر میں تعصب اور پہلے سے وضع کردہ تقلیدی اندازِ فکر کسی بھی تحقیق یا تخلیق پارے کو صحیح طور پر جانچنے اور آنکنے کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ مقالہ نگار نے نہ صرف غلام احمد پرویز کی ہمہ پہلو خبر لی ہے بلکہ ان کے پیش روؤں اور ان کی فکر کے حامل اکابرین کو بھی گویا ایک مشن کے طور پر آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ یوں مقالہ نگار (حافظ محمد دین قاسمی) کا ''علمی وتحقیقی جائزہ'' نہ علم کی بلندیوں پر گیا ہے اور نہ تحقیق کی رفعتوں کو پا سکا ہے۔ ایک بڑے، اہم اور دورِ جدید کے لئے قرآنی معارف کی تعلیم وترویج کا موجب بننے کے بجائے یہ مقالہ قرآن فہمی کی راہ میں مزاحم ثابت ہوسکتا ہے۔ پروفیسر غازی علم الدین صاحب نے بھی شاید مقالے کی بساط وعدالت اور تکرار وحجت سے اخذ کردہ نتائج کے سایوں میں کہہ دیا ہے کہ ''زیادہ سے زیادہ جناب غلام احمد پرویز کو فکری اعتبار سے گمراہ قرار دیا جاسکتا ہے، کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جاسکتا'' کسی حد تک یہ بھی ایک ڈھیلا رویہ ہے۔

بحیثیت مجموعی ہماری یہ قومی سائیکی بن چکی ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ کفر کے فتوے دینا اور دوسروں کو لیبل زدہ کرنا ہی ایک شافی، مسکت اور مدلل جواب ہے۔ ہم لکیر کے فقیر، آسانی پسند، جھرلو کے سحر میں گرفتار لوگ ہیں۔ بالخصوص قرآن فہمی سے ابھی ہم بہت دور ہیں جب کہ بقول علامہ اقبال:

صد جہاں باقیت در قرآن ہنوز
اندر آیاتش یکے خود را بسوز

گویا قرآن مجید میں ہنوز حرف ومعنی اور علوم ومعارف کے سیکڑوں جہان زندہ اور اَن چھوئے باقی ہیں۔ اس کی آیاتِ محکمات کی گہرائیوں کی غواصی کرنے کے لئے اپنے آپ کو مشقت میں تو ڈال کر دیکھو۔ ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ ہم قرآن اور صاحبِ قران کے مرتبے اور معیار ہی کو نہیں پا سکے بلکہ بموجب فرمانِ الٰہی ''وقال الرسول یٰرب ان قومی اتخذ واھذا القرآن مھجورا'' (اور رسول اللہ فرمائیں گے کہ اے میرے رب! یہی میری وہ قوم ہے جس نے اس قرآن کو خود ساختہ رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم بھی چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ (انھوں نے اپنے آپ کو اس کے تابع رکھنے کے بجائے اسے اپنے مسلک و مشرب کے تابع رکھ چھوڑا تھا)۔ (سورۃ الفرقان، آیت نمبر:۳۰) آج بھی قرآن کو سمجھنے کے لئے اور اس کے معنی تک رسائی کے لئے جو اصول اختیار کیے گئے ہیں وہ وہی ہیں کہ جو اصل میں انسانی تحریروں کی تحلیل وتاویل کے لئے وضع کیے گئے تھے۔ قرآن تو

عربی زبان میں نازل ہوا جو اپنے مطالب میں بڑا واضح ہے۔ قرآن صاف اور آسان بھی ہے لیکن قرآن مجید کو جو 'وحی خالص' ہے اسے سمجھنے کے لیے 'وحی خفی' سے سب سے زیادہ افادہ کیا گیا ہے۔ تمام تفاسیر قرآن وحی خالص کے اپنے تقاضوں کے بجائے وحی خفی پر انحصار کر کے لکھی گئی ہیں۔ تفاسیر کی تمام کتب شانِ نزولی، فقہی، ادبی، تاریخی، نحوی، لغوی اور کلامی موشگافیوں اور تفصیلات سے لدی پھندی ہیں۔ شاید اس پس منظر میں علامہ اقبال کہتے ہیں کہ:

منزل و مقصودِ قرآن دیگر است
رسم و آئینِ مسلمان دیگر است

اسی قرآنی حوالے سے ''تنقیدی و تجزیاتی زاویے'' میں ایک اور قابل توجہ مضمون ''حضرت یونسؑ اور قومِ یونسؑ کا تاریخی اعزاز'' ہے۔ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان نے تفسیری تسامحات پر اپنا نقطہ نظر پیش کر کے غور و فکر کے لئے سنجیدگی کے ساتھ دعوتِ تفکر دی ہے۔ اس پر پروفیسر غازی علم الدین نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ اسرائیلی روایات کی کثرت نے نزولِ قرآن کی نسبت اللہ تعالیٰ کی مراد اور منشا کو دھندلا کر رکھ دیا ہے''۔ (تنقیدی و تجزیاتی زاویے، ص۹۱-۹۹)

یہی وجہ ہے کہ آج ہم نے قرآن مجید کو محض قصے کہانیوں کی کتاب برائے خواندگی کا درجہ دے دیا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے جدید علم الکلام میں قرآن مجید کی ہدایات کو بھی انسانی کلام کے پند و نصائح کی طرح ایک خاص دور اور خاص جغرافیائی خطے تک محدود کر دیا ہے۔ قرآن کی عملی تعلیمات پر بھی اسرائیلیات اور عجمی رنگ چڑھ گیا اور پھر سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ قران میں مذکور انبیائے عظام کے قصص اور عبرت آمیز واقعات سب غیر عربی اور غیر قرآنی اساطیر زدہ ہو گئے۔ انبیاء کے اسوۂ حسنہ اور سیرتیں بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ مسلمانوں نے اپنی سادگی اور تشنہ کامی کی رَو میں بہہ کر بلا حیل و حجت سب کچھ غیر قرآنی کو قرآنی سمجھ کر بڑے خلوص کے ساتھ سینے سے لگا لیا۔ قرآن حکیم کی اصطلاحات اور عربوں کے خاص روزمروں کی توضیح و تشریح کو بھی غیر عربی اساطیر الاولین کے توہماتی قصے کہانیوں کا اسیر بنا کر رکھ دیا گیا اور آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ سیرِ انبیاء کے جو فطری قرآنی معیار و اوصاف ہوتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کو ان کے بجائے خود ساختہ تاریخی، عام انسانی شمائل و فضائل اور پیغمبرانہ عظمتوں اور رسولی شیونات سے بھی پست کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ یہ صرف اس لئے وقوع پذیر ہوا کہ ہمارا قرآن مجید سے سروکار فہم کے ادنیٰ اور پست معیارات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اور بقول شخصے ''اب دین کے دائرے میں کارفرما ہمارے نام نہاد علمی ذہن کا واحد کام یہ ہے کہ باطل سے نمو یافتہ نظریات، دریافات، ایجادات اور نظامات کا سوال اٹھے تو وہ زور زور سے سر ہلائے اور بلبلا کر غل مچائے کہ ہاں یہ بھی قرآن میں ہے، اور ہاں یہ تو قرآن میں پہلے سے ہے'' ہماری اس فہمی وند پر باطل کا کوئی کل پرزہ خندہ زن ہو جائے تو یہ ہماری علمیت کا سب سے بڑا ثمر ہے''۔ بہر صورت قرآنی موضوع خیالات افروز اور موجبِ لمحۂ فکریہ ہے۔

حضرت یونسؑ بن متیٰ کا نام سورۃ یونسؑ میں بطور علامت استعمال ہوا ہے۔ آپ اسرائیلی بادشاہ یربعام (۷۸۱ ق م) کے ہم عصر تھے اور اہلِ نینوا کی طرف مبعوث ہوئے۔ حضرت یونسؑ کے بارے میں قرآن کی سورۃ النساء، الانعام، الصافات اور القلم

میں خاص قرآن کے اپنے انداز واسلوب میں کچھ بنیادی، ضروری اور بحوالہ کارِ نبوت معلومات موجود ہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں اہم باتیں قرآن مجید میں محفوظ ہیں۔ لیکن اس قرآنی واقعے اور آپؑ کی تبلیغی خدمات، مشکلات اور اہم حقائق کو ذوق قصص طرازی کے لئے ''اسلامی اسرائیلیات'' سے معمور کر دیا ہے۔ یوں حضرت یونسؑ اور آپؑ سے وابستہ پوری جدوجہد اور پیغمبرانہ مشن کہ جس کی وجہ سے ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ لوگ تبلیغ رسالت سے بہرہ یاب ہو کر ہر طرح کے ادبار و آلام اور عذاب سے مامون و مصئون ہو گئے، وہ سب حقائق قصہ گوئی اور افسانہ آفرینی کی نذر ہو کر کسی الہامی کتاب کے بجائے عام اساطیری داستان سے زیادہ اور کچھ نہیں ہیں۔ حالانکہ حضرت علیؑ کے بموجب ''جمیع العلم فی القرآن لاکن تقاصر عنہ افہام الرجال'' (قرآن مجید علوم کا بہت بڑا خزانہ لامتناہی ہے۔ لیکن لایعقل لوگوں نے اپنی فہم و فراست کی کوتاہی کی نذر کر رکھا ہے)۔

اپنی اس کتاب میں پروفیسر غازی علم الدین نے واقعیت پسندی سے تنقید کر کے ہر تخلیقی شاہکار کے بارے میں آگہی بھی پیدا کی ہے۔ ہر مضمون میں انھوں نے تنقیدی اصول وضوابط اور آئینِ علم ادب سے انطباق کی عملی سعی کی ہے۔ تنقید کا ایک منصب یہ بھی ہے کہ اس میں فروغِ ادب اور قوی اصلاح کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ خالص تنقید نقد النقد کو جنم دیتی ہے تو اس میں احتساب کا عمل بھی در آتا ہے۔ ان تنقیدی و تجزیاتی زاویوں میں ادبی احتساب قدرے قوی ہے۔ تنقید میں راست ترجمانی قارئین کی رہنمائی کا موجب بنتی ہے۔ یہ بھی مترشح ہوتا کہ مصنف قوی محبت، تعمیری جذبات اور ادبی معیارات کی پابندی کے حوالے سے ادبِ عالیہ کی تخلیق کا متمنی ہے اور مقصدی ادب بنیادی طور پر اعلیٰ انسانی اقدار کا غماز اور موجبِ اصلاح احوال بھی ہوتا ہے۔ تنقید اسی طرح کے ادب کی صحیح قدر و قیمت متعین کرتی ہے لہٰذا تنقید فعلِ فضول نہیں بلکہ عملِ عقیل ہے۔

تنقیدی و تجزیاتی زاویے میں شامل ''گلیوں کے لوگ'' اقبال حسن خاں کی کتاب تحریک پاکستان کے آخری چند برسوں اور آزادی کے بعد ابتدائی پندرہ بیس سال کے احوال و واقعات پر لکھا ہوا ایک ناول ہے۔ لاریب موضوع بڑا توانا اور عوامی ہے۔ ناول میں سیکولر افکار و نظریات کو اس عہد کے تاریخی وجوب کے تابع پیش کیا گیا ہے۔ جا بجا مذہبی اور دنیاوارانہ فیشن زدہ امور، عوامی عوامل اور گلیوں کے لوگوں کی عمومی عامیانہ زندگی کی غمازی کرتا ہوا ناول ہے۔ دنیا جہان میں استعماری قوتوں کے خلاف جو بھی قومیں جدوجہد کرتی رہیں اور جب بھی انھوں نے پُرامن یا خونی انقلاب کے بعد آزادی اور خودمختاری حاصل کی، ان سب کے احوال و واقعات معمولی تفاوت کے باوجود ایک ہی طرح کے امورِ ناگزیر ہوتے ہیں۔ اس عرصۂ حراست میں انسانی بنیادوں پر جسمانی تقاضے اور ضروریات بہرصورت زندہ رہتے ہیں۔ وہیں سے ادیب کہانیاں بناتے ہیں اور دیگر تخلیقات بھی رونما ہوتی رہتی ہیں۔ بر عظیم پاک و ہند کی تقسیم، جرمنی کی تقسیم اور دوبارہ انضمام سے پہلے اور بعد بالخصوص بحوالہ دیوارِ برلن، مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بننا، فلسطین اور پھر پاک بھارت ۶۵ء اور ۷۱ء کی جنگوں کے دوران میں اور بعد میں بھی کہانیاں بنیں۔ ان تحریروں میں چاہے منٹو کا 'کھول دو' ہو یا جرمنی اور فلسطینی کہانیاں، سب میں مرد و زن کے کرداروں کے جنسی تقاضوں اور جذبوں کے اظہار میں متعدد مصنفین نے موضوعی اسالیب کے بجائے جذباتی رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ یوں کئی تحریروں میں ظلم و ستم سے بیزاری اور نفرت ثانوی رہ جاتی ہے، بے راہ روی کا غالب پرتو جنسی جذبات کی عملی تشریح پر منتج ہو جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں فن کار اور تخلیق کار ایک حد تک خود لذتی اور

حظوظِ خویش کی پروجیکشن کر کے حقائق وواقعات کو انسانی رویوں سے نکال کر ابتذالی راہوں پر لے آتے ہیں۔

'گلیوں کے لوگ' میں بادیٔ النظر یہی سیکولر رویے جو مذہبی عقائد کے بجائے اخلاقیات پر تو مبنی ہونے چاہئیں، وہ تو بے دینی نما ضرور ہو جاتے ہیں۔ جس دور کے بارے میں یہ ناول تحریر ہوا اس وقت روسی، چینی اور ترقی پسند مصنفین کے نظریات کا دور دورہ تھا۔ لیکن سیکولر نظریات کن اخلاقیات پر قائم ہوتے ہیں؟ وہ سیکولر ازم کہ جس میں ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے حصولِ مقصد تو نہ ثابت ہو سکا لیکن اس میں بے باکی، بے حجاب براہ راست اظہار، حقائق وحالات کے بیان میں بے خوفی، لذت اندوزی، غیر اخلاقی اور غیر ادبی صاف گوئی، کرداروں کی فطری کمزوریوں اور انسانی جذبات کے اظہار و بیان میں خود ساختہ ''اخلاقی قرینوں'' سے انسانیت کی تحقیر و تہدیم، بے جا جنسی جذباتی اٹل حقائق کو پرکشش اور لذتیت زدہ کر کے پیش کرنے ہی کو 'ادب' بنانا شروع کر دیا۔ تقسیم ہند اور اس کے بعد کے ابتدائی برسوں میں ایسی تحریروں اور کتابوں کی ضرورت تھی کہ جن میں گلیوں کے لوگوں کی مختلف حوالوں سے قربانیوں کا ذکر ہوتا۔ وہی تقاضائے دوراں بھی تھا۔ ہجرت کر کے آنے والوں نے جو عذاب اٹھائے، جن مصائب اور دوسروں کے روا رکھے ہوئے عوائب میں وہ مبتلائے ابتلا رہے وہ سب نا قابل فراموش بھی ہیں اور شانِ انسانیت کا خاصا بھی۔ پھر بے گھر مہاجرین کے ساتھ انصار نے جو حسنِ سلوک، دلجوئی، رواداری اور معاشرتی قبولیت کے عملی مظاہرے کیے وہ سب کہانیاں اور افسانے نہیں بلکہ تعمیر و ترقی وطن کا اساسی اور قوی حصہ ہیں۔ لیکن یار لوگوں نے محض فنِ افسانہ نویسی اور ذوقِ ناول نگاری کو نئے ابعاد بخشنے کے لئے ہر طرح کی بے راہ روی، ترقیمی خیانت، سفلی جذبات کی تسکین اور ایغو کے آفلی تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ بنا لیا۔ ان ساری شعوری ادبی کوششوں میں موضوع کے اصل عناصر اور ضروریات پر کوئی توجہ نہ دی گئی صرف افسانہ طرازی اور تزئین ناول نگاری کے مقاصد ہی کو سامنے رکھا گیا۔ یہ ہمارے اردو ادب ہی کا نہیں پورے عالمی ادب کا المیہ ہے۔

پروفیسر غازی علم الدین نے ''اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر'' میں نذیر فتح پوری کے لسانی تقابل کا تنقیدی مطالعہ پیش کر کے بہت حوصلہ افزا لسانی معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ حقیقت بھی خوش آئند ہے کہ بھارت میں بھی اردو زبان و ادب اور قاموس و لغت پر قابلِ قدر کام ہوتا رہتا ہے۔ آج کی اردو زبان میں بالخصوص جو عربی اور فارسی الفاظ موجود ہیں، وہ تو بھارت کی دوسری زبانوں میں بھی معمولی رد و بدل کے ساتھ ضرور موجود ہیں کیوں کہ بقول نذیر فتح پوری ''کوئی بھی زبان خود متعصب نہیں ہوتی بلکہ بعض زبانوں کے بولنے والے ضرور متعصب ہوتے ہیں'' اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو میں کسی طرح کے تعصب کی کہیں گنجائش ہی نہیں ہے۔ ''اردو کا یہ بنیادی وصف ہے کہ دیگر زبانوں کے اصناف سخن کو بھی کشادہ دلی سے اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے''۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو زبان (و ادب) ایک قوی لسانی اکائی ہے جو دیگر زبانوں اور قوموں کے الفاظ کو بلا تعصب اور بلا امتیازِ مذہب و ملت بڑی طلب و چاہت سے قبول کرتی رہتی ہے۔ ''اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر'' ایک اہم مضمون ہے۔

'میر پور کا چاند' لندن سے شائع ہونے والے 'یورپین اردو رائٹرز' سوسائٹی کے زیر اہتمام ادبی، علمی اور تحقیقی جریدہ میں چھپا ہے۔ اس کے شمارہ مارچ ۲۰۱۳ء میں دیپک کنول کا ایک افسانہ ہے۔ غازی صاحب کے محاکمے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غیر ذمہ داری سے لکھی ہوئی گمراہ کن تحریر ہے۔ بیرون ملک رہنے والے کشمیریوں کی دل آزاری کا موجب بننے والا یہ افسانہ کسی

صورت میں بھی کشمیریوں کی صحیح ترجمانی نہیں کرسکا۔ میرپور کی اصل صورتِ حال اور وہاں کے مسلمانوں کی اخلاقی، معاشرتی، معاشی وذہنی حالت اور معیارات حیات کے بارے میں پروفیسر غازی علم الدین سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ میرپور کے بارے، میں 'میرپور کا چاند' جیسے مضامین کی بار بار تنسیخ وتردید کی ضرورت ہے۔ غازی صاحب کی اسی کتاب میں ''تاریخ میرپور کا ایک اہم باب'' (از پروفیسر عبدالواحد قریشی)، و یپک کنول کے ''میرپور کا چاند'' کو گہنانے کے لئے کافی وشافی ہے۔

تنقیدی وتجزیاتی زاویوں میں شامل دیگر تحریروں میں ''ڈاکٹر سیّد قاسم جلال کی شاعری میں تصوف ومعرفت کے عناصر'' ایک مکمل اور بھرپور مضمون ہے۔ ڈاکٹر صاحب تاحال شاعری، تنقید، تحقیق، ڈرامہ اور افسانہ نگاری کے علاوہ خاکہ نویسی اور فن انٹرویو میں بھی دسترس رکھتے ہیں۔ غازی صاحب نے سیّد قاسم جلال کی شاعری کے حوالے سے جو تصوف اور معرفت کا انتخاب مع ناقدانہ عطفی عبارتیں اور تلازماتی تحریریں پیش کیا ہے وہ آگاہی آمیز اور قابلِ مطالعہ ہے۔ اسی طرح زاویے میں شامل مضمون ''نونیاز کا تجزیاتی مطالعہ'' ڈاکٹر رفیع الدین احمد صدیقی کا پہلا شعری مجموعہ کثیر الابعاد حیثیتوں کا حامل ہے۔ اس میں مردِ مومن کی فراست اور حق گو فرد وفرید کی بے باکی بھی موجود ہے۔ زاویوں میں ''شکیل احمد خاں کے افسانے کے عناصر ترکیبی'' متعدد، متنوع اور بوقلموں ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں دیہاتی عورت کی زندگی اور معمولات پر جو ہمدردانہ خیال آرائی کی ہے، اس میں احترامِ خواتین اور تکریمِ نسواں کے جذبات کارفرما ہیں۔

''میرے وردنہ پچھانے کوئی'' مصنف کا ایک پنجابی مضمون ہے۔ یہ مضمون افضل راز صاحب کے پنجابی کے ممتاز پرچے ''کانگاں'' کے بہانے سے تحریر کیا گیا ہے۔ 'کانگاں' بلاشک وشبہ پنجابی کا ایک اہم پرچہ ہے جس کی خدمات ہمہ پہلو اور ناقابل تردید ہیں۔ 'کانگاں' کے حوالے سے پیش کی ہوئی یہ تحریر پختہ کار پنجابی دانشور کا شاہکارِ تازہ ہے۔ اس میں پروفیسر صاحب نے پنجاب کے اصل رنگ ڈھنگ کی پژمردگی اور پنجابی ثقافت کے بنیادی دیہی مظاہر کی تہذیم وتخریب کا واویلا بھی کیا ہے اور انھیں یاد کر کے تاسف اور تحیر زدہ کر دیا ہے۔ پھر انھوں نے اپنے اسی مضمون میں اپنے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور اور ہاسٹل کی یادوں، اپنے دور کے معتبر اور محترم اساتذہ، دوستوں اور دیگر طالب علموں کی باتوں اور رونقوں کو زندہ اور بولتے رنگوں میں پیش کر دیا ہے۔ پروفیسر صاحب کی پنجابی زبان وادب سے محبت اور پنجابی دانی ایک نیا مظہر ہے جو مسلسل اظہار کا بھی متقاضی ہے۔

پروفیسر غازی علم الدین کی کتاب ''تنقیدی وتجزیاتی زاویے'' کا مطالعہ اس حقیقت کو اور بھی نکھار کر سامنے لاتا ہے کہ تخلیق کار اور فن کار تو نمائندہ ہوتا ہے دانائیوں کا، حقیقتوں کا، سچائیوں اور صداقتوں کا۔ وہ اٹل اکائیوں سے بھی صرفِ نظر نہیں کرتا۔ اس لئے ادب کا برائے زیست ہونا وصفِ اول ٹھہرتا ہے۔ ادب برائے زندگی اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ اس کے اندر ضرور کچھ نہ کچھ حیات بخش افکار ہوں۔ اس لئے ہمارے عہد کے ناقدینِ ادب، پروپیگنڈا، ایجوکیشن اور صحافت کو ادب سے جداگانہ سمجھیں، اور تنقید میں برملا دیکھیں کہ ان کے زیرِ نظر تخلیقی شہ پارے محض جذباتِ مجردہی کی توعکاسی نہیں ہیں۔ کیا تخلیق یا ادب پارہ قلب وذہن میں افکار وتاثرات کی صورت بار آور بیج بوتا ہے کہ نہیں۔ تخلیق کار کس حسن وخوبی، بے تکلفی اور صداقت وشرافت اور سادگی کے ساتھ روئیدگی کے لئے تیار پیاسی زمین کی آبیاری کر رہا ہے کہ نہیں۔ جاننا چاہیے کہ سچا تخلیق کار اپنی تخلیقات کے ذریعے

سے پڑھنے والوں میں اور اکی سطح پر سوچ بچار کی راہیں روشن کرتا ہے اور اپنی تخلیقات سے دوسروں کے افکار و خیالات کو متحرک کرتا ہے۔ حسین فانتزیاں (Fantasies) بھی تخیل کو بڑی آسودگی کے ساتھ نئی ولایتوں میں لے جاتی ہیں۔ تخلیق کار اگر چہ واعظ اور ناصح نہیں ہوتا لیکن وہ اپنے قارئین کو فطری سے انداز و اسلوب میں غور و فکر کی دعوت نو دیتا ہے۔ ان اوصاف کا تعین اور نشان دہی ناقد ہی کر سکتا ہے۔

آج کا ادب اور تخلیقات کا ایک متعدبہ حصہ تقلیدیات زدہ ہے یا تعصب اور کسی خاص طرح کی تفہیم اور مقصد کی پیداوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تو ''سپانسرڈ وار'' یعنی پروکسی جنگوں کی طرح پروکسی یا ''سپانسرڈ لٹریچر'' بھی رواج پا چکا ہے۔ کئی ممالک میں علوم و فنون میں پروکسی ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں بھی ایک معمول بن چکی ہیں۔ اس پر مستزاد دنیا جہان کی اقوام و ملل کے بارے میں تقلیدی اندازِ فکر سب سے زیادہ خطرناک مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ شاید اسی لئے اب نئے تناظر، نئے پیراڈائم اور نئے شعوری معیاراتِ نقد و نظر لابدی ہو چکے ہیں۔

ادارۂ قرطاس کی زیرِ طبع تصانیف

۱۔ معارفِ شبلی: معارف، اعظم گڑھ میں شبلی نعمانی کی تاریخ نویسی کے حوالے سے شائع ہونے والے مقالات کا مجموعہ۔

ترتیب و تدوین: ڈاکٹر محمد سہیل شفیق۔

۲۔ شبلی نعمانی صدی کے آئینے میں: پاکستانی رسائل و جرائد میں شبلی نعمانی پر شائع ہونے والے مقالات کا مجموعہ۔

ترتیب و تدوین: ڈاکٹر مہ جبین زیدی۔

۳۔ الطاف حسین حالی صدی کے آئینے میں: پاکستانی رسائل و جرائد میں الطاف حسین حالی پر شائع ہونے والے مقالات کا مجموعہ۔

ترتیب و تدوین: ڈاکٹر مہ جبین زیدی۔